اسلامی تزکیۂ نفس

ا۔ فرد اور جماعت

ب۔ یہ وہ دنیائے عمل ہے جہاں ہر تیاری خود مقصد کی نوعیت سے معیّن ہوتی ہے۔

ج۔ بنیادی اوصاف، جو اصلاح و تعمیر کی راہ میں آگے بڑھنے والوں کے لیے ضروری ہیں۔

د۔ برائیاں، جن سے اس مقصد عظیم کے خادموں کو بہرحال اور بہر قیمت پاک ہونا چاہیے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

اسلامی نقطۂ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے۔ خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ حقوق اور فرائض فرد پہ عائد کیے گئے ہیں۔ امر و نہی کے احکام فرد کو دیئے گئے ہیں۔ طاعت پر جزا کی امید فرد کو دلائی گئی ہے اور عصیاں پر سزا کی دھمکی بھی فرد ہی کو دی گئی ہے۔ اس نظامِ فکر و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کی ابتداء میں عامل کی حیثیت سے اور انتہاء میں نتیجہ عمل میں پانے والے کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے یہ اپیل کرتا ہے، اسی کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا مخاطب بناتا ہے، اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گرا دے تو آخری فیصلہ میں اس جماعت اور اجتماعی نظام کی خوبی اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتی جس سے وہ دنیا میں تعلق رکھتا تھا بلکہ اگر وہ کسی اچھی جماعت اور صالح اجتماعی نظام سے وابستہ تھا اور پھر اس نے اپنی تکمیلِ ذات اور ارتقاءِ شخصیت کے ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے تو یہ چیز اس کے خلاف ایک اور قوی دلیل بن جائے گی اور اسے اور زیادہ خسران میں مبتلا کرے گی۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنی کوشش سے اس کمال کو پہنچ جائے جس کو پہنچ سکتا تھا اور اپنی شخصیت کو اتنا بہتر نشوونما دے سکتا تھا تو جماعت اور اجتماعی نظام کا فساد اس کی

فلاح و نجات میں مانع نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ چیز اس کے حق میں ایک دلیل ہو گی کہ اس نے نا موافق حالات میں ترقی کے لیے اتنی کامیاب جدو جہد کی۔ یہی ہیں اس آیت کے معنیٰ جو سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوئی ہے کہ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ اور اس کے عکس کی صحت پر خود اس آیت کا مضمون دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ لَا يَنفَعُكُم مَّنِ اهْتَدَىٰ إِذَا ضَلَلْتُمْ۔

فرد اور جماعت

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جماعت اور اجتماعی نظام کی اصلاح اسلام کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ فی الواقع اس کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ بجائے خود مطلوب ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کے جوہر ذات کی تکمیل جماعت ہی کی اصلاح اور اجتماعی نظام کی بہتری پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کو فرد فرد کی صورت میں پیدا تو ضرور کیا ہے مگر فرد فرد کی صورت میں رکھا نہیں ہے۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اجتماعی زندگی کے بہت سے اثرات جو اس کی ماں اور اس کے باپ نے اپنے اندر جذب کیے تھے، موروثی صفات و خصائص کی صورت میں اس کے اندر پیوست ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ اس کی شخصیت کے نشو و نما پر اچھا خاصا اثر ڈالتے ہیں۔ اور اجتماعی زندگی اس کے پیدا ہونے کی ساعت سے لے کر موت کی گھڑی تک پیہم اس پر اثر ڈالتی اور اس سے اثر قبول کرتی رہتی ہے۔ اگر اجتماعی ماحول کسی غلط نظام پر قائم ہو، اس کی آب و ہوا اصلاح کے بجائے فساد کو پرورش کرنے والی ہو، اس کی زمین خیر کے بجائے شر کے لیے سازگار ہو تو ان حالات میں اکثر و بیشتر افراد کی تکمیلِ ذات

دشوار بلکہ محال ہے یہاں تک کہ بسا اوقات اس ماحول میں وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر ایک جلیل القدر پیغمبر پکار اٹھتا ہے کہ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝

اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ جماعت کو درست اور اجتماعی نظام کو پاک کیا جائے تاکہ بیشتر انسانی افراد کے لیے ساز گار ماحول پیدا ہو جس میں ان کی شخصیتیں صحیح نشوونما پا سکیں حرام کی روٹی جس سے پرورش پائے ہوئے گوشت پوست کے لیے جنت حرام ہے اور جس کے حق میں نبیؐ صادق و مصدوق نے خبر دی ہے کہ آتشِ دوزخ ہی اس کے لیے اولیٰ ہے، آخر کوئی فرد اس سے کیوں کر بچے اور رزقِ حلال کہاں سے پائے جب کہ ایک غلط نظامِ معیشت نے رزق کے سارے چشموں کو گندہ کر دیا ہو؟ جاہلیت کے اخلاق اور افکار و اعمال جو انسان کے لیے ابدی خسران کے موجب ہیں، آخر کوئی شخص ان سے کس طرح محفوظ رہے جب کہ تمدن، معاشرت، تعلیم سب پر جاہلیت پورے زور کے ساتھ چھائی ہوئی ہو اور اس کا زہر وبائی سمیت کی طرح سارے اجتماعی ماحول میں سرایت کر گیا ہو؟ معصیتِ خدا اور رسولؐ جس کے ساتھ کسی کمال کے حصول اور کسی شخصیت کے ارتقاء کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، آخر کوئی شخص اس سے کہاں تک پرہیز کر سکتا ہے جب کہ ایک کافرانہ نظامِ سیاست نے کامل تسلط حاصل کر کے پوری پوری قوموں کو کفر اور ظلم اور فساد کی خدمت پر مجبور کر دیا ہو؟ پس فرد کی نجات و فلاح بہت مشکل بلکہ محال ہے اگر اس کی ترقی اور تکمیل کے راستے سے ان موانع کو دور نہ کیا جائے جو ایک بگڑے ہوئے اور فاسد نظامِ اجتماعی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں اور ایک ایسا صالح اجتماعی نظام نہ قائم کر دیا جائے جو اس تکمیل اور ترقی میں

مددگار ہو۔

اجتماعیّت ۔ فرد کی امتحان گاہ

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے اور اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی اور تکمیل کا راستہ ہی اجتماعی زندگی کے اندر رکھا ہے نہ کہ اس کے باہر۔ فرد کی وہ امتحان گاہ جس میں اسے اپنی لیاقت یا نالائقی ثابت کرنی ہے اور جس میں کامیابی یا ناکامی ہی پر آخرت میں اس کی فلاح و خسران کا مدار ہے کسی خلوت کدے یا کسی سنسان جنگل میں واقع نہیں ہے بلکہ حیاتِ اجتماعی کے عین منجدھار میں واقع ہے اس کو اکیلا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بے شمار تعلقات کے رشتوں میں باندھ دیا گیا ہے۔ وہ کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی، کسی کا شوہر، کسی کا باپ، کسی کا دوست، کسی کا دشمن، کسی کا ہمسایہ، کسی کا مستاجر، کسی کا حاکم، کسی کا محکوم، کسی کا بائع، کسی کا مشتری، کسی کا امین، کسی کا مؤتمن بنایا گیا ہے۔ اور اس کا امتحان ہی اس امر میں ہے کہ ان سب تعلقات میں بندھ کر ذمہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لد کر، خوف اور لالچ محبت اور غضب، امیدوں اور مایوسیوں کے ماحول میں رہ کر وہ کس طرح اللہ کے عائد کردہ حقوق اور فرائض ادا کرتا ہے، کس طرح اس کے مقرر کردہ حدود پر قائم رہتا ہے، کس طرح خلافت کے اس منصب سے عہدہ برآ ہوتا ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے کن صفات کا اکتساب کرتا ہے، کن خصوصیات کو اپنے اندر نشوونما دیتا ہے اور اپنی سیرت و کردار کے کیسے نقوش دنیا میں چھوڑ کر جاتا ہے نیکی کا تصور جو اسلام پیش کرتا ہے وہ ہر معنیٰ سے خالی ہو جاتا ہے اگر فرد کو اجتماعی زندگی سے الگ کر لیا جائے جس شخص نے تمدنی

تعلقات کے جتنے کم شعبوں میں قدم رکھا ہے اور جتنی کم ذمہ داریاں لی ہیں، اس نے گویا اسی قدر کم پرچوں میں امتحان دیا ہے اور اسی لحاظ سے اپنی شخصیت کو اتنے ہی پہلوؤں میں تکمیل کے مواقع سے محروم کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ جس نے خلوت میں رہبانیت کی زندگی گزاری اس نے اپنے امتحان کے اکثر و بیشتر پرچے سادہ اوراق کی صورت میں بھیج دیئے جن پر وہ سرے سے کوئی نمبر پانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں کہ فرد کی تکمیلِ ذات اجتماعی زندگی کے اندر ہی ہو سکتی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بیشتر اور بزرگ تر احکام سرے سے تشنۂ تعمیل رہ جاتے ہیں اگر انسانی اجتماع کی زمام کار اہلِ خیر کے ہاتھ میں نہ ہو۔ تمدن اور سیاست اور معیشت کی عنانِ اقتدار پر باغیوں کا قبضہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ خدا کی شریعت معطل رہے، اس کی زمین میں صلاح کے بجائے فساد پھیلے، اس کی خلق میں امر بالمعروف کی جگہ امر بالمنکر ہو اور نہی عن المنکر کے بجائے نہی عن المعروف ہونے لگے۔ یہ وہ حالت ہے جس سے بڑھ کر اللہ کو مبغوض کوئی چیز نہیں اور کسی شخص کا اس حالت میں رہتے ہوئے یہ توقع رکھنا کہ خلوت کے مراقبوں اور ریاضتوں سے، یا نیکی اور تقویٰ کے چند مظاہر سے یا ان احکام کی تبلیغ سے جو کفار کے لیے نامرغوب نہ ہوں، اپنی ذات اور ارتقائے شخصیت کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ فرمانروائی کے مقام سے خدا کے باغیوں کو ہٹانے کی کوشش کی جائے اور سعی و جہد کی ساری قوتیں اس مقصد میں صرف کر دی جائیں کہ خدا کے ملک میں اس کی شریعت جاری ہو۔ اس کی زمین فساد سے پاک ہو کر خیر و صلاح سے بھر جائے اور اس کی خلق میں حکم معروف کا چلے اور منکر ضابطہ تعزیرات میں جگہ پائے۔

اسلام کا مطالبہ — فرد سے

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جماعت اور اجتماعی زندگی کی اسلام میں کتنی بڑی اہمیت ہے لیکن اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اصل اہمیت فرد ہی کو حاصل ہے کیونکہ اجتماعی اصلاح کا قیام اور اجتماعی فساد کی بیخ کنی افراد ہی کی فلاح کے لیے مطلوب ہے۔
اس کے بعد یہ کہنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی کہ تمام نظاماتِ فکر و عمل سے بڑھ کر اسلام انفرادی اصلاح و تزکیہ کو اہمیت دیتا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر ان نظامات سے بھی مختلف ہے جو جماعت سے قطع نظر کر کے فرد کو مجرد ہونے کی حیثیت سے لیتے ہیں اور اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رکھ کر اس کو روحانی ارتقاء کے مدارج طے کرا دینا چاہتے ہیں۔ اور ان نظامات سے بھی جو فرد کی انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے اس کی ذات کو محض جماعت کی خاطر اہمیت دیتے ہیں اور افراد کو صرف اس لیے تیار کرنا چاہتے ہیں کہ کسی اجتماعی مفاد کے حصول میں ان کی تربیت یافتہ قوتوں کو استعمال کرنا ہے ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے الگ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوع انسانی کا ایک ایک فرد اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کے سامنے جواب دہ ہے اس لیے ہر فرد کو فرداً فرداً خدا کے سامنے اس کی جواب دہی بہت بڑی حد تک اجتماعی حقوق، فرائض اور ذمہ داریوں ہی سے متعلق ہے، اور آخری امتحان کی کامیابی کے لیے اس کا تیار ہونا بجائے خود بھی اجتماعی صلاح و فلاح پر منحصر ہے۔ اور خدا کی رضا حاصل کرنے میں وہ کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی حدِ استطاعت میں فساد کو مٹانے اور خدا کے احکام اس کی زمین اور اس کی خلق پر جاری کرنے کا وہ فرض انجام نہ دے جو خلیفہ ہونے کی حیثیت سے

اس پر عائد کیا گیا ہے۔ لہٰذا فرد کی تیاری محض اپنی ذاتی اصلاح ہی کی حد تک نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ اس درجہ کی ہونی چاہیئے کہ وہ غیر صالح اجتماعی نظاموں سے لڑ سکے اور ایک صالح اجتماعی نظام کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کا بل بوتا اس میں پیدا ہو جائے۔

مگر صدیوں انحطاط سے مسلمانوں کے اندر جہاں اور بہت سے تغیرات ہوئے ہیں، تزکیۂ نفس کے باب میں بھی ان کا تصوّر اصل اسلامی تصور سے بہت کچھ مختلف ہو گیا ہے۔ ان کے مقصد میں بھی تغیّر آگیا ہے۔ نقطۂ نظر بھی محدود ہو گیا ہے اور تزکیۂ نفس کے طریقے بھی ان طریقوں سے مختلف ہو گئے ہیں، جو عہد نبوت میں اختیار کیے گئے تھے اس کا نتیجہ ہے کہ تزکیۂ نفس کے بڑے بڑے ادارے اور سلسلے مدتوں سے قائم ہیں لیکن ان کی موجودگی ہی میں جاہلیت اپنی تلوار سے، اپنے قلم سے، اپنے علوم و فنون سے، اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سے نہ صرف دنیا کو بلکہ خود مسلمان ملکوں اور قوموں کو بھی فتح کرتی چلی گئی ہے اور چلی جا رہی ہے۔ آخر اس کمزوری کا سبب تو ضرور ہے، اور جو سبب بھی ہو اس کی تحقیق میں بے جا عقیدت مانع نہ ہونی چاہیے۔

ہمارے ہاں ایک بڑے گروہ کے نزدیک تزکیۂ نفس کا مقصد یہ رہا ہے کہ اسی زندگی میں مشاہدۂ حق نصیب ہو جائے اور ایمان بالغیب کے مقام سے ترقی کر کے ایمان بالشہادت کی دولت حاصل ہو۔ ظاہر نظر میں یہ ایک بلند ترین مقصد ہے لیکن قرآن نے کہیں ہم کو یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم اسے مقصود قرار دے کر اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دیں بلکہ اس کے برعکس اگر ہم بطورِ خود اسے مقصود قرار دے بھی لیں تو قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ گوہرِ مقصود اس زندگی میں نبیؐ کے سوا کسی کے ہاتھ نہیں آسکتا۔

"(حقایقِ غیب کا جاننے والا اللہ ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ بجز اُس

رسول کے جس کو اس نے خود منتخب کیا ہو، پھر وہ اس کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے فرشتے لگا دیتا ہے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے" در حقیقت انسان کو ان حقایق کے جتنے اور جس قدر علم کی ضرورت تھی' اللہ نے وہ علم اپنے رسولوں کے ذریعہ سے دیدیا ہے۔ اور یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس طرح اس نے انسان کو ان چیزوں کی تلاش و جستجو کی زحمت سے بچا دیا۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ وہ رسولوں کے دیئے ہوئے علم پر ایمان بالغیب لائے اور جو خدمات اس کے سپرد کی گئی ہیں انھیں اطمینان کے ساتھ انجام دے۔

اس تزکیۂ نفس کا مقصد روحانی ترقی بھی بتایا جاتا ہے۔ مگر یہ روحانی ترقی کچھ ایسی مبہم اور پُراسرار چیز ہے کہ تمام عمر اس بھول بھلیاں میں گشت لگانے کے بعد بھی آدمی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس مقام پر پہنچا۔ اس کی اصطلاحیں، اس کی منزلیں اس کے ثمرات و نتائج' سب رموز ہیں جن کو ہم جیسے عامی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ ہمیں اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ صرف یہ کہ اس راہ میں جو منزلیں طے کی جاتی ہیں؛ ان میں وہ منزل کبھی نہیں آتی جسے بلالؓ اور عمارؓ اور صہیبؓ نے طے کیا تھا اور نہ وہی منزل کبھی آنے کی توقع کی جا سکتی ہے جس کو ابوبکرؓ و عمرؓ نے طے کیا۔

اسلام کے مقصد سے قریب ترین مقصد ان لوگوں کا ہے جو تزکیۂ نفس سے تقویٰ کا حصول چاہتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک دوسری مصیبت پیش آجاتی ہے اور وہ یہ کہ تقویٰ کے متعلق بالعموم لوگوں کا نقطۂ نظر بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں چند مذہبی اعمال کی پابندی کرنے اور معمول سے کچھ زیادہ عبادت کر لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اس محدود تصور میں وسیع تر اجتماعی مسائل کے فہم و ادراک کی کوئی گنجائش

نہیں ہوتی۔

یہ وہ دنیائے عمل ہے جہاں ہر تیاری خود مقصد کی نوعیت سے معین ہوتی ہے

قاعدے کی بات ہے کہ انسان تیاری اس مقصد کی مناسبت سے ہی کیا کرتا ہے جو اس کے پیش نظر ہو۔ تیاری بجائے خود کوئی معنیٰ نہیں رکھتی وہ ہمیشہ کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ مقصد کی نوعیت ہی اس کی نوعیت متعین کرتی ہے۔ مقصد کی وسعت یا محدودیت کے لحاظ ہی سے اس کا پیمانہ وسیع یا محدود ہوتا ہے، اور مقصد ہی کا مزاج تیاری کے ممکن طریقوں میں سے مناسب تر طریقے کا انتخاب کرتا ہے۔ بسا اوقات مختلف مقاصد کے لیے بڑی حد تک ایک ہی طرح کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر مقصد کے لیے وہ ناگزیر ہوتی ہیں۔ لیکن اس ظاہری مماثلت کے اندر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو صاف محسوس کیا جا سکتا ہے کہ مختلف مقاصد کی ملتی جلتی تیاریوں میں بھی ہر مقصد کی روح اپنی جداگانہ شان کے ساتھ کارفرما ہوتی ہے اور ابتدائی مرحلوں سے گزر کر تکمیلی مراحل جتنے جتنے قریب آتے جاتے ہیں، ان تیاریوں کے راستے بالکل ایک دوسرے سے الگ اور دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر دیکھئے، اسلحہ سازی ایک قسم کی تیاری ہے۔ آپ خواہ کسی غرض سے اسلحہ بنائیں۔ بہرحال صنعت کے چند طریقے آپ کو وہی اختیار کرنے ہوں گے جو کسی دوسری غرض کے لیے اسلحہ بنانے والا اختیار کرے گا۔ لیکن ابتداء ہی سے وہ مقصد جس کے لیے آپ اسلحہ بنا رہے ہیں، آپ کی اس تیاری کے پیمانے اور اس کی نوعیت اور اس کے مناہج

کو ان دوسرے لوگوں کی تیاریوں سے مختلف کر دے گا جو دوسرے مقاصد کے لیے یہی کام کر رہے ہوں۔ فرض کیجئے آپ صرف ایک فنِ لطیف (فائن آرٹ) کی حیثیت سے خوبصورت اسلحہ تیار کرنا چاہتے ہیں جس سے آپ کا مقصد محض اپنے اور اپنی سی ذہنیت رکھنے والوں کے ذوقِ جمال کو تسکین دینا ہے، ایک دوسرا شخص پیشہ ور اسلحہ ساز ہے اور ایک تیسرا شخص اس لیے اسلحہ بناتا ہے کہ اُسے ایک فوج تیار کرنی ہے اور ان ہتھیاروں سے کوئی جنگی مقصد حاصل کرنا ہے۔ ان تین مختلف مقاصد کے لیے آپ اور وہ' دونوں اسلحہ سازی کے بہت سے مشترک طریقے اختیار کریں گے، لیکن تینوں کے مقاصد کا اختلاف پہلے قدم ہی سے تینوں کی راہیں الگ کر دے گا اور تکمیلی مراحل کی طرف جتنا جتنا قدم بڑھے گا یہ راہیں ایک دوسرے سے بعید اور بعید تر ہوتی چلی جائیں گی۔

فنِ لطیف ہونے کی حیثیت سے آپ جو اسلحہ سازی کریں گے، اس میں آپ کے لیے نفیس نفیس تلواریں اور بندوقیں بنانا بجائے خود مقصود ہوگا۔ کسی دوسرے مقصد کے لیے ان کو آلہ و ذریعہ بنانے کا سوال نہ ہوگا۔ آپ کی نگاہ میں اصل اہمیت اسلحہ کی نفاست، خوشنمائی اور ستھرائی کی ہوگی، خواہ وہ کارزار میں اپنی کاٹ اور مار کے اعتبار سے بالکل ناقص ہی کیوں نہ ثابت ہوں۔ آپ اسلحہ سازی کے طریقوں میں سے اختیار صرف انھیں طریقوں کو کریں گے جن سے لطیف ترین، نازک ترین، حسین ترین ہتھیار بن سکیں اور عجائب دکھا کر ہر صاحبِ ذوق سے دادِ تحسین لیں۔ ان طریقوں کی طرف تو نظر اٹھا کر دیکھنا بھی آپ کو گوارا نہ ہوگا جن سے بھاری بھرکم، ہولناک اور بھیانک قلعہ شکن ہتھیار اور میدان مار اسلحہ بنا کرتے ہیں۔ آپ کی تلواریں اس لیے نہ ہوں گی کہ صفوں کو اُلٹ دیں بلکہ اس لیے ہوں گی کہ ہوا میں ریشمی رومال کاٹ دیں

آپ آتش بار اسلحہ آتشبازی کے لیے نہیں بلکہ آتشبازی کے لیے بنائیں گے۔ آپ کی توپ اس لیے نہ ہوگی کہ میدان جیتے بلکہ اس لیے ہوگی کہ اس کا گولہ آسمان پر جا کر پھٹے اور رنگ برنگ کے پھول برسائے۔ پھر آپ کے اس کارخانے کی کشش بھی ان خریداروں کو نہ کھینچے گی جنھیں لڑنے کے لیے ہتھیار درکار ہیں بلکہ کھینچے گی ان خوش ذوق لوگوں کو جو لڑائی بھڑائی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، محض آپ کی طرح آرٹ کے دلدادہ ہیں وہ آپ کے بنائے ہوئے اسلحے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور انھیں خوبصورت غلافوں میں لپیٹ کر اپنے کمرہ کی زینت بنائیں گے۔ بہت سے بہت اگر کوئی کام انھوں نے ان ہتھیاروں سے لیا بھی تو بس یہ کہ کچھ نشانہ بازی کی مشق کرلی، کچھ تلوار کے ہاتھ صاف کر لیے، کبھی کوئی جانور مار لیا اور کبھی تماشائیوں کے مجمع میں سپہ گری کے کمالات دکھا کر خراج تحسین وصول کر لیا۔

رہا پیشہ ور اسلحہ ساز تو وہ اچھے سے اچھے اسلحہ بنا کر سرِ بازار رکھ دے گا کہ جس کا جی چاہے قیمت دے اور خرید لے جائے۔ اس کی تلوار اس کے اپنے کام کی نہ ہوگی۔ خریدار کے کام کی ہوگی۔ وہ اس پر باڑھ رکھے گا اور خریدار اس کی کاٹ سے فائدہ اٹھائے گا۔ ہر قسم کے خریداروں کی ضروریات کے لیے اس کے کارخانے میں ہر قسم کے ہتھیار ملیں گے۔ شکاری شکار کے لیے، ڈاکو ڈاکہ زنی کے لیے، جہانگیر کشور کشائی کے لیے، مجاہد راہِ حق میں جہاد کے لیے وہاں سے ہتھیار پائے گا۔ وہ خود کسی مقصد خاص کا خادم نہ ہوگا بلکہ مقاصد دوسروں کے ہوں گے۔ اس بے مقصد اسلحہ سازی کا اثر لازماً صنعتِ اسلحہ کے طریقوں پر بھی پڑے گا۔ فن کے معلوم و معروف طریقے تو پوری مہارت کے ساتھ اس کارخانے میں استعمال کیے جائیں گے، لیکن کارزار میں کام

آنے کے لیے اسلحہ میں جن عملی خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے، انھیں پیدا کرنے کا طریقہ اس پیشہ ور فن کار کو سرے سے معلوم ہی نہ ہوگا۔ اس کا حال وہی ہوگا جو گذشتہ جنگ عظیم میں امریکہ کے اسلحہ ساز کارخانوں کا تھا کہ بازار کے چلتے ہوئے اسلحے تو وہ خوب بنا سکتے تھے مگر کارزار کے عملی تجربوں سے جنگ آزما قوموں نے اسلحہ سازی میں جو کمالات پیدا کیے تھے ان کی ہوا تک ان پیشہ ور اسلحہ سازوں کے مال کو نہ لگی تھی۔ جیسا کہ مسٹر لائڈ جارج نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں امریکہ کے اسلحے اپنی چمک دمک اور شان اور نفاست سے نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے مگر میدان کی امتحان گاہ میں ناکام ثابت ہوتے تھے۔

بخلاف اس کے جو شخص اسلحہ اس لیے بناتا ہے کہ اس کے پیش نظر ایک جنگی مقصد ہے جس کے لیے وہ اپنی فوج کو اپنے ہی ہتھیاروں سے مسلح کرنا چاہتا ہے، اس کا معاملہ آپ کے اور اس پیشہ ور اسلحہ ساز کے معاملہ سے قطعاً مختلف ہوگا۔ ڈھلائی اور صیقل گری اور آتش کاری کے ابتدائی اصول اس کے ہاں بھی وہی ہوں گے جو آرٹسٹ اور پیشہ ور کے ہاں ہوں گے۔ مگر ان کا استعمال اس کے ہاں بالکل مختلف طور پر ہوگا۔ اس کو اسلحہ کی نفاست و خوشنمائی کی اتنی پروا نہ ہوگی جتنی ان کی کاٹ اور مار کی ہوگی۔ کوئی ہتھیار چاہے کتنا ہی خوشنما ہو اگر میدان کی آزمائش میں پورا نہ اُتر سکے تو وہ اس کے کسی کام کا نہ ہوگا۔ البتہ بھونڈے سے بھونڈا ہتھیار بھی اس آزمائش میں پورا اتر سکے تو اس کی نظر میں نہایت پسندیدہ ٹھہرے گا۔ اسے مظہر العجائب ہتھیاروں کی حاجت نہ ہوگی۔ بس کارگر ہتھیار مطلوب ہوں گے۔ اسے وہ توپ درکار ہوگی جس کا گولہ قلعوں کو پاش پاش کر دے، چاہے اس سے پھول ایک بھی نہ جھڑے۔ اس کو وہ تلوار مرغوب

ہو گی جو دشمن کے اندر دو کش تا کمر اُتر جائے، چاہے چمک کا نام بھی اس میں نہ ہو اور ہوا کے رومال کا ایک تار بھی نہ کاٹ سکے۔ ان خوبیوں کے ساتھ اگر ستھرائی اور نفاست و خوشنمائی بھی ہو تو کیا کہنے مگر مقابلتہً وہ کارگر مگر بھونڈے ہتھیار کو حسین مگر کند ہتھیار پر ہزار درجہ ترجیح دے گا۔ پھر وہ صناعت اسلحہ سازی کے معلوم و متعارف طریقوں کا بھی غلام نہ ہو گا۔ بلکہ میدان کے تجربوں پر انھیں پرکھے گا اور ان تجربات کی روشنی میں اصول صناعت کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقوں سے استعمال کرنے کی کوشش کرے گا خواہ وہ فن کے مروجہ طریقوں کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہوں پھر ان کا مقصد ہی یہ متعین کرے گا کہ صناعتِ اسلحہ سازی کے اصول پر جن اقسام کے ہتھیار بننے ممکن ہیں، ان میں سے کس قسم کے ہتھیار بنائے اور کس قسم کے نہ بنائے ہوئے بہت سے وہ ہتھیار جو فن لطیف کی اغراض کے لیے یا پیشہ ور کی دوکان کے لیے عین مطلوب ہے، سرے سے اس کے کارخانہ کی اسکیم میں جگہ ہی نہ پائیں گے۔ اور بہت سے ان ہتھیاروں کو اس کے یہاں سر فہرست جگہ ملے گی جنھیں بنانے کی ضرورت نہ فن کار محسوس کرتا ہے نہ پیشہ ور۔ پھر وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس بات کا تصور تک نہ کر سکے گا کہ اپنے بنائے ہوئے ہتھیار اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے۔ فن کار اپنے فن میں مگن ہوتا ہے اس کا کسی کارزار سے تعلق ہی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کا دوست یا دشمن ہو۔ پیشہ ور ہر خریدار کا نیازمند ہوتا ہے، اس کو اس سے کیا بحث کہ خریدنے والے اس کا بنایا ہوا مال کس غرض سے خرید رہے ہیں۔ مگر یہ جنگ آزما اسلحہ ساز تو میدان میں دوست بھی رکھتا ہے اور دشمن بھی، اس کے لیے تو نا ممکن ہے کہ اپنا ایک تیر بھی دشمن کے ترکش میں جاتا دیکھ سکے۔ جب اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کا کارخانہ دشمن کے ہاتھ پکڑ کر اس کے لیے اسلحہ بنائے گا تو یہ

خود اسے اپنے ہاتھ سے ڈائنامیٹ لگا کر اُڑا دیتا ہے اور اس بات کی کچھ پروا نہیں کرتا کہ میں نے برسوں کی محنت اور اربوں روپے کے صرف سے یہ کارخانہ بنایا تھا۔

جس طرح اسلحہ سازی ایک قسم کی تیاری ہے اسی طرح تزکیۂ نفس بھی ایک قسم کی تیاری ہی ہے۔ تزکیہ کے دو معنیٰ ہیں پاک صاف کرنا اور نشو و نما دینا۔ ان دونوں معنوں کے لحاظ سے تزکیۂ نفس کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو غیر مطلوب صفات سے پاک کیا جائے اور مطلوب صفات کی آبیاری سے اس کو پروان چڑھایا جائے پس در حقیقت تزکیۂ نفس اور اخلاقی تیاری دونوں ہم معنیٰ ہیں اب یہ ظاہر ہے کہ جس طرح دوسری تمام تیاریوں کے معاملہ میں "تیاری بجائے خود" ایک مہمل چیز ہے اسی طرح یہ اخلاقی تیاری بذات خود مہمل ہے تاوقتیکہ یہ بات واضح طور پر معین نہ ہو کہ تیاری کس مقصد کے لیے ہے۔ مقصد ہی اس امر کا فیصلہ کرنے والی چیز ہے کہ کون سی صفات اس کے حصول میں مددگار ہیں جن کو نشو و نما دینے کی سعی کی جائے۔ مقصد ہی اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کس پیمانے کا انسان درکار ہے جسے بنانے کی کوشش کی جائے اور کس پیمانے کے انسان غیر مفید یا ناکافی ہیں جن کے بنانے کی یا تو کوشش ہی نہ ہو، یا جن کے بن جانے پر اکتفا نہ کیا جائے۔ مقصد ہی کی نوعیت پر اس سوال کا فیصلہ بھی منحصر ہے کہ تزکیۂ نفس کے طریقوں میں سے کون سا طریقہ پیمانۂ مطلوب کے انسان تیار کرنے کے لیے مناسب تر ہے اور تزکیہ کی تدابیر میں سے کن کن تدبیروں کو کس تناسب کے ساتھ استعمال کیا جائے کہ اس پیمانے کے انسان ڈھل سکیں۔

تزکیۂ نفس اور انسان کا نصب العین

یہ مقصد کا سوال اس تزکیۂ نفس کے مسئلہ میں اتنا اہم ہے کہ نہ صرف تزکیہ کی نوعیت اور اس کے پیمانہ اور اس کی منہاج ہی کا اس پر انحصار ہے، بلکہ فی الحقیقت

یہ سب کچھ قرآن کے منشاء کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ مؤلف نے یہ نہیں سمجھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کے بنائے ہوئے امیر نہیں تھے نہ خود بن گئے تھے بلکہ خدا کے مقرر کیے ہوئے امیر تھے۔ آپؐ کی امارت آپؐ کی رسالت سے الگ نہ تھی۔ دراصل آپؐ رسولِ خدا کی حیثیت ہی سے امیر تھے بلکہ صحیح یہ ہے کہ آپؐ امیر نہیں بلکہ مامور من اللہ تھے۔ مؤلف نے اسی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ اسی لیے رسول اللہؐ کی حیثیت امارت کو عام امراء کی سی حیثیت امارت سمجھ لیا۔

اپنے اس خیال کی تائید میں مؤلف نے قرآن کی جن آیات سے استدلال کیا ہے ان کو بھی وہ ٹھیک نہیں سمجھے ہیں۔ بلا شبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر وہ اس لیے تھا کہ آپ اپنی امت کے لیے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے جمہوریت (DEMOC R ACY) کے صحیح اصول کی طرف رہنمائی کریں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپ کی حیثیت دوسرے امراء کی سی ہے۔ دوسرے امراء کے لیے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورہ سے کام کریں۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ:۔۴) اور یہ کہ اگر شوریٰ میں نزاع ہو تو وہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء:۔۸) لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی چیز کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسہ کرکے عمل کا اقدام فرمائیں فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران:۔۱۷)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے، بلکہ آپ کو شوری کا حکم صرف اس لیے دیا گیا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرزِ حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔

رہی یہ بات کہ امیر کی حیثیت سے آنحضرت صلعم کی اطاعت صرف آپ کے عہد تک تھی، تو یہ بھی غلط ہے کہ جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا کہ۔ مؤلف نے۔ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ سے یہ سمجھا ہے کہ اطاعت رسول کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس وقت اس حکم کو سن رہے تھے۔ لیکن اگر وہ سورۂ انفال کو ابتدا سے پڑھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہاں مقصود ہی کچھ اور ہے۔ ابتداء میں فرمایا گیا ہے کہ۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ہ" اگر ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو"۔ پھر ان لوگوں کو ڈانٹا گیا ہے جو رسول اللہ کی دعوتِ جہاد پر دلوں میں کڑھتے تھے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ہ (الانفال۔۲)	اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول سے جھگڑا کرتا ہے اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

اس کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ہ (الانفال ۔۳)	اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور رسول کے حکم سے منہ نہ موڑو جب کہ تم سن رہے ہو۔

اس آیت میں اور پچھلی تمام آیات میں رسول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا جس سے یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے پھر ہر جگہ لفظ رسول آیا ہے، امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا اور نہ کوئی مخفی سے مخفی اشارہ ایسا موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں رسول سے مراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو رسالت سے مختلف ہو پھر رسول کے حکم سے منہ موڑنے کو منع کیا گیا ہے جس پر سخت عذاب کی دھمکی اوپر دی جا چکی ہے اس کے بعد وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ کہنے کا منشاء صاف یہ ہے کہ تم ہمارے ان تاکیدی احکام کو سنتے ہوئے ہمارے رسول کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑو، اس وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے۔ بلکہ قیامت تک جو لوگ ایمان کے ساتھ قران کو سنیں گے ان سب پر لازم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم ان کو پہونچے اس کے آگے سر تسلیم خم کریں۔

اور یہ جو مؤلف نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض امارت اسی طرح ہنگامی ہیں جس طرح دوسرے امراء کے ہوا کرتے ہیں۔ کیوں کہ آج ہم جہاد میں بدر و احد کی طرح نیزہ و شمشیر سے نہیں لڑ سکتے۔ تو یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں جن اسلحہ سے کام لیا وہ اسلحہ تو ضرور ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتے تھے لیکن حضورؐ نے اپنی لڑائیوں میں جو اخلاقی ضوابط برتے تھے اور جن ضوابط کو برتنے کی ہدایت فرمائی تھی وہ کسی عہد کے لیے مخصوص نہ تھے بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک

دائمی قانونِ جنگ بنا دیا ہے۔ شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ سوال اہمیت نہیں رکھتا کہ آپ تلوار استعمال کرتے ہیں یا بندوق یا توپ، بلکہ اہمیت اس سوال کی ہے کہ آپ اپنے اسلحہ کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کس طرح ان سے خونریزی کا کام لیتے ہیں۔ اس باب میں جو نمونہ آنحضرت صلعم نے اپنے غزوات میں پیش فرمایا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسلامی جہاد کا ایک مکمل نمونہ ہے اور معنوی حیثیت سے سرور عالمؐ قیامت تک کے لیے ہر مسلمان فوج کے سپہ سالارِ اعظم ہیں۔

مؤلف نے امارت اور رسالت میں ایک فرق اور بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے امراء سے نزاع اور اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے، اب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امیرانہ حیثیت ویسی ہی ہے جیسی دوسرے امراء کی ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی مسلمان کو نزاع کا حق حاصل تھا؟ جس امیر کے مقابلے میں آواز بلند کرنے تک کی اجازت نہ تھی اور جس کے مقابلہ میں محض اونچی آواز سے بولنے پر تمام عمر کے اعمال غارت ہو جانے کی دھمکی دی گئی تھی (حجرات۔ ۱) اور جس سے جھگڑا کرنے والے کو دوزخ میں جھونک دیئے جانے کا خوف دلایا گیا تھا (النساء- ۱۷) کیا اس امیر سے منازعت کرنے کا حق کسی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کہاں اس امیر کی امارت اور کہاں ان امراد کی امارت جن سے منازعت کا حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

مؤلف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت امارت اور عام امراء کی حیثیتِ امارت میں قطعاً کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے حتیٰ کہ ان تمام احکام

کو جو اطاعت رسول سے متعلق ہیں۔ اطاعت امیر کے احکام قرار دے دیا ہے۔
صفحہ ۱۵۷ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

"اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں اکثر جہاں جہاں ساتھ آئے ہیں ان سے مراد امارت ہے جس کا قانون کتاب اللہ ہے اور جس کے نافذ کرنے والے رسول اللہ یا ان کے جانشین ہیں۔ مثلاً: یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ہ (۸-۱) مال غنیمت کا حکم صرف عہد رسالت تک محدود نہ تھا بلکہ آئندہ کے لیے بھی ہے جس کی تعمیل خلافت کا فریضہ ہے"

پھر فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کے متعلق صفحہ ۱۵۸ پر حاشیہ لکھتے ہیں:۔

"آخری اختیار اللہ و رسول یعنی امارت ہے اس لیے رسول اللہ کا جو منصب بحیثیت امیر کے ہے وہی ان کے خلفاء کا بھی ہوگا"

یہ حق سے صریح تجاوز ہے۔ قرآن مجید میں اطاعت خدا، اطاعتِ رسول اور اطاعت اولی الامر کے تین مراتب بیان کیے گئے ہیں۔ اطاعتِ خدا سے مراد قرآن مجید کے احکام کی اطاعت ہے۔ اطاعت رسول سے مراد رسولِ مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کی پیروی ہے اور اطاعت اولی الامر سے مراد مسلمانوں کے امراء اور اربابِ حل وعقد کی اطاعت ہے۔ پہلے دونوں

مراتب کے متعلق قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ خدا اور رسول کے احکام میں کسی چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے خدا اور رسول کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرے۔ رہا تیسرا مرتبہ تو اس کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسول کے احکام کے تابع ہے اور نزاع کی صورت میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ ایسے صاف اور کھلے ہوئے احکام کے موجود ہوتے ہوئے اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا اور رسول سے مراد امارت لی جائے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امارت کو اس امارت کے ساتھ ملا دیا جائے جو مسلمانوں کے عام امراء کو حاصل ہے۔ اس معاملہ میں قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے "اموال غنیمت خدا اور رسول کے لیے ہیں" کہنے کا مدعا یہ ہے کہ خدا اور رسول نے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کیا ہے اس کے مصالح میں یہ غنائم صرف کیے جائیں اس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد امارت ہے۔

حدیث کے متعلق مؤلف کا مسلک

حدیث کے متعلق مولف نے قریب قریب وہی مسلک اختیار کیا ہے جو منکرین حدیث کے ایک بڑے گروہ کا مسلک ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

> تعلیم کتاب کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ رسول اس کے احکام پر عمل کر کے دکھا دے تاکہ امت اسی نمونہ پر عامل ہو جائے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — تمہارے لیے رسول اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ ہمارے رسولؐ نے جملہ احکام قرآنی مثلاً نماز، روزہ، حج زکوٰۃ، وغیرہ پر عمل کر کے دکھلا دیا اور مسلمان اسی نمونہ پر عمل کرنے لگے۔ یہ اسوۂ حسنہ امت کے پاس عمل متواتر کی شکل میں موجود ہے جس کے مطابق رسولؐ اللہ کے عہد سے نسلاً بعد نسلٍ وہ عمل کرتی چلی آتی ہے۔ اس لیے یہ یقینی اور دینی ہے اس کی مخالفت خود قرآن کی مخالفت ہے"

دوسری جگہ مؤلف نے لکھا ہے:۔

"۔ غیر یقینی شے کا دین میں کچھ دخل نہیں"

ان عبارات اور مؤلف کی ان تصریحات سے جو اوپر بیان ہو چکی ہیں ان کا مسلک واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ:۔

۱:۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عدالتی فیصلے اور وہ قوانین جو آپ نے سیاسی، جنگی اور تمدنی و اجتماعی امور میں امیرِ قوم کی حیثیت سے نافذ کیے تھے اس اسوۂ رسول کی تعریف سے خارج ہیں جن کی پیروی کا حکم عام قرآن میں دیا گیا ہے۔ لہٰذا ان کی اب ضرورت نہیں رہی۔ کیوں کہ امارت کے فرائض ہنگامی ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے۔

۲:۔ صرف ان امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل (نہ کہ قول) قابلِ تقلید ہے جو عبادات اور دینی اعمال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی احکام پر عملدر آمد کرنے کی صورت خود اپنے عمل سے بتادی ہے۔

۳:۔ مؤلف کے نزدیک صرف وہ عمل متواتر یقینی ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد سے اب تک جاری ہے۔ اور جس کی پیروی ہر نسل اپنے سے پہلی نسل کو دیکھ کر کرتی رہی ہے۔ رہیں وہ روایات جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہیں تو وہ یقینی نہیں ہے اور دین میں ان کا کچھ دخل نہیں ہے۔

ان میں سے پہلی دونوں باتوں کے متعلق میں قطعیت کے ساتھ کہتا ہوں کہ قرآن کے بالکل خلاف ہیں۔ قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ حکم نکلتا ہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے محض مذہبی اعمال ہی دائماً قابل تقلید ہیں۔ رہے تمدنی و اجتماعی امور میں آپ کے فیصلے اور آپ کے نافذ کردہ قوانین، تو وہ صرف اس عہد کے لیے مخصوص تھے جس عہد میں وہ نافذ کیے گئے تھے۔ اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں ہو جس سے ان دونوں قسم کے اعمال میں فرق کیا جا سکتا ہو۔ اور دونوں کے احکام مختلف قرار دیئے جا سکتے ہوں تو اس کو پیش کیا جائے۔ مجھ کو تو قرآن میں صاف حکم یہ ملتا ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ	کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر میں فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے معاملہ

لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؀ (احزاب ۵)	میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگا۔

اس آیت میں زمانہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مومن اور مومنہ سے خاص عہد رسالت کے مومن مرد و عورت مراد نہیں لیے جا سکتے۔ اَمْرًا کا لفظ نہایت عام ہے جو ہر قسم کے معاملات پر حاوی ہے۔ خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی اللہ اور رسول سے مراد اللہ اور رسول ہی ہیں "امارت" ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ امیر یا اولی الامر بہرحال مومن ہی ہوں گے اور یہاں تمام مومنین و مومنات سے یہ حق سلب کر لیا گیا ہے کہ خدا اور رسول نے جس معاملہ کا فیصلہ کر دیا ہو اس میں انھیں مجتمعاً یا منفرداً خود فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار باقی رہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ "جو اس کے خلاف عمل کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگا" یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کی ہدایت سے اس کے رسول نے اپنے احکام اور اپنے قوانین سے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کر دیا ہے اس کا قیام منحصر ہی اس پر ہے کہ جو احکام جاری کر دیئے گئے ہیں اور جو قوانین نافذ کر دیئے گئے ہیں ان کی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جائے۔ اگر خدا اور اس کے رسول کی قولی و عملی رہنمائی سے قطع نظر کر کے لوگ خود اپنی رائے اور اپنے اختیار سے کچھ طریقے اختیار کریں گے تو یہ نظام باقی نہ رہے گا اور اس نظام کے ٹوٹتے ہی تم راہ راست سے بھٹک کر بہت دور نکل جاؤ گے۔ تعجب ہے کہ جس قرآن

میں ایسی صاف اور صریح ہدایت موجود ہے۔ اس کی تعلیمات لکھنے والے نے وہ مسلک اختیار کیا ہے جو آپ ابھی سن آئے ہیں۔

رہی تیسری بات تو اس کے متعلق میں نے اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ اپنے مضمون "حدیث اور قرآن" میں بیان کیے ہیں۔ اس لیے یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ میں جناب مؤلف سے صرف یہ سوال کروں گا کہ اگر کوئی شخص ان تمام بدعات وخرافات کو جو آج مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں رائج ہو گئی ہیں وہ "یقینی عمل متواتر" قرار دے۔ جو رسول اللہ کے عہد سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آرہا ہے۔ اور اس بنا پر انھیں داخل دین سمجھے تو آپ کے پاس کون سا ایسا یقینی ذریعہ ہے جس سے آپ یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ عمل رسول اللہ کا نہیں ہے بلکہ بعد کے لوگوں کی ایجاد ہے؟ آپ فرمائیں گے کہ ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کریں گے اور اس کی آیات سے ان بدعات کی تردید کر دیں گے مگر میں کہتا ہوں کہ اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل سے آیات قرآنی کے معانی کی جو تعین ہوتی ہے اس کو نظر انداز کرنے کے بعد آیات کی تاویل میں ایک بدعت پسند انسان اتنی گنجائش نکال سکتا ہے کہ اس کی بہت سی بدعتوں کی تردید مشکل ہو جائے گی۔ دوسرے اگر آپ نے قرآن سے اس کی بدعات کی تردید کر بھی دی تو یہ اس کے اس دعوے کی تردید نہ ہوگی کہ یہ وہی یقینی عمل مواتر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آرہا ہے۔ آپ اپنے مسلک کے مطابق اس عمل متواتر کو غیر یقینی کہہ نہیں سکتے اور آپ تاریخ سے بھی (جو روایات کی طرح غیر یقینی ہی ہونی چاہیئے)

یہ استدلال نہیں کر سکتے کہ یہ بدعات عہد رسالت میں نہ تھیں ۔ بلکہ فلاں عہد میں جاری ہوئیں ۔ اب صرف یہی صورت رہ جاتی ہے کہ آپ ان کو یقینی مان لیں ۔ پھر یا تو ان کی پیروی کریں یا یہ فیصلہ کر دیں کہ عمل رسول تعلیم قرآن کے خلاف تھا ۔ معلوم نہیں کہ فاضل مؤلف اور ان کے ہم خیال حضرات کے پاس اس پیچیدگی کا کیا حل ہے ۔ ؟ (ترجمان القرآن رجب ۵۳ھ، اکتوبر ۳۴ء)
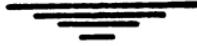
رسالت اور اس کے احکام

میرے مضمون "اتباع و اطاعتِ رسولؐ" کو دیکھ کر میرے دوست چودھری غلام احمد پرویز صاحب نے اپنے ایک طویل مراسلہ میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے :-

"۔۔ لیکن مجھے آپ کی وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کی تفسیر سے کچھ اختلاف ہے۔ آپ نے لکھا ہے۔

"جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت پر سرفراز کیا اس وقت سے لے کر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔"

پھر دوسری جگہ آپ لکھتے ہیں :-

"آنحضرتؐ جس وقت جس حال میں جو کچھ کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے۔"

اس سے مقصد واضح ہے کہ حضورؐ کا ہر فعل اور ہر قول من جانب اللہ ہوتا تھا اور بحیثیت رسول صادر فرمانے کی بنا پر امّت مسلمہ کے لیے واجب الاطاعت۔

اس کے متعلق یہاں صرف دو ایک اشاروں پر اکتفا کروں گا پہلے تو قرآن کریم کو لیجئے۔ آپ کو متعدد ایسے امور ملیں گے جن میں حضورؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تہدید و تادیب ہوئی ہے۔ مثلاً آپ نے ایک قسم کا شہد کھانے سے قسم کھالی تو ارشاد ہوا۔

يَآ اَيُّهَا النَّبِىُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (تحریم)

اے نبی جس کو اللہ نے تمھارے لیے حلال کیا ہے اسے تم حرام کیوں کرتے ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا شہد کو اپنے اوپر حرام کر لینا خدا کی جانب سے تھا تو خدا اس پر معترض کیوں ہوا۔ ؟

دوسری جگہ ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (توبہ)

اے نبی خدا نے تم سے درگذر کیا تم نے انھیں کیوں اجازت دیدی تھی ؟

اب اگر حضورؐ کا اجازت دیدینا ازروئے وحی تھا اور یہ فعل خدا کے رسول کی حیثیت سے تھا تو اس پر وحی بھیجنے والے نے تہدید کس لیے فرمائی ؟

اسی طرح عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (عبس)

اگر حضور کا پیشانی پر بل لے آنا بحیثیت رسول تھا تو قرآن کریم میں اس پر تنبیہ کیوں آئی۔؟

ان تصریحات سے صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ کے یہ افعال و اقوال بحیثیت رسول نہ تھے بلکہ ذاتی حیثیت سے تھے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ امور ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس کی بنا پر تھے بلکہ یہ کہ امور دنیاوی میں بہ حیثیت بشر خاصہ بشریت حضورؐ کے ساتھ تھا جس میں ایسے معمولی سہو کوئی معنیٰ نہیں رکھتے اور اس سے حضورؐ کے خلق عظیم اور قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لیے دشمنانِ اسلام کے لیے زندہ شہادت ملتی ہے۔ اب اس کی شہادت خود احادیث سے بھی ملتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک باب اس عنوان سے لکھا ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ جو کچھ آنحضرتؐ سے مروی ہے اور کتب احادیث میں مدوّن ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔

ایک تو وہ امور جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ امور جن کو تبلیغ رسالت سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی کی نسبت حضورؐ نے فرمایا ہے۔

انما انا بشر مثلکم اذا امرتکم بشیٔ من دینکم فخذوا به واذا امرتکم بشیٔ من رأیی فانما انا بشر۔	میں ایک انسان ہوں جب تم سے کوئی مذہبی امر بیان کروں تو اس کو اختیار کرو اور جو بات میں اپنی رائے سے کہوں تو میں ایک انسان ہوں۔

اسی بنا پر درخت خرما کے گابھا لگانے کے مشہور واقعہ کے بعد حضورؐ نے فرمایا تھا:۔

انی ظننت ظنا ولا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم من اللہ بشیئ فخذوا بہ فانی لم اکذب علی اللہ۔	میں نے صرف ایسا گمان کیا تھا تخمینی بات کا مجھ سے مواخذہ نہ کرو لیکن میں خدا کی جانب سے کوئی بات بیان کروں تو ان کو اختیار کرو۔ اس لیے کہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا۔

چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں وہ امور ہیں جنھیں حضورؐ عادۃً کیا کرتے تھے یا اتفاقیہ بلا قصد یا بہ سبیل تذکرہ بیان فرماتے ہیں اور اس کے بعد وہ ان مواقع و امور کی مثالیں بھی بیان فرماتے ہیں۔ ان ہی میں وہ ان امور کو بھی لیتے ہیں جو حضورؐ کے عہد میں ایک جزئی مصلحت رکھتے تھے۔ لیکن وہ تمام امت کے لیے حتمی اور لازمی نہ تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ آپ دین کے متعلق فرماتے تھے وہی بحیثیت رسول ہوتا تھا اور خواہ وہ وحیٔ منزل ہو یا اجتہادِ رسولؐ۔ اور وہی امت کے لیے واجب الاتباع تھا اور اس کے علاوہ جو باتیں بحیثیت بشر فرماتے۔ ان میں یہ قید نہ تھی یہی وجہ تھی کہ بعض امورِ مشاورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ نے رائے بھی

پیش کی اور وہ اختیار بھی کی گئی یہی نہیں حضورؐ کی ایسی رائے کے خلاف
عمل بھی تھا۔ چنانچہ قرآن شاہد ہے کہ آپؐ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا
کہ "امسك علیك زوجك"، لیکن انھوں نے حضرت زینبؓ
کو طلاق دیدی۔ کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ بحیثیتِ رسول آپؐ
کا فرمان ہوتا اور حضرت زیدؓ اس کی خلاف ورزی کرتے؟ کتب
احادیث میں کئی ایسے واقعات مذکور ہیں جن میں حضور نے کوئی ارشاد
فرمایا اور صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ حکم بحیثیت رسول ارشاد فرمارہے ہیں
یا بطور اپنی رائے کے۔ چنانچہ جنگ بدر میں آپ ایک مقام پر کیمپ
نصب فرمانا چاہتے تھے تو ایک صحابی نے یہی سوال کیا اور جب معلوم
ہوا کہ حضورؐ اپنی رائے سے ایسا فرمارہے ہیں تو انھوں نے با دب
گذارش کیا کہ اگر حضور ذرا آگے جاکر خیمہ زن ہوں تو زیادہ قرینِ
مصلحت ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

ان تصریحات سے ثابت ہوا کہ حضورؐ ہر آن اور ہر حال میں
رسول نہیں ہوتے تھے۔ اور آپ کا ہر قول اور ہر فعل بہ حیثیت
رسول ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہاں جو مردِ خدا محبوب کے رنگ میں رنگا جانا
چاہے اس کی بات بالکل جُدا ہے۔ لیکن اس شکل اور وجوب کی
صورت میں بڑا فرق ہے۔

اگرچہ شاہ صاحب نے حضورؐ کے فیصلے بھی اسی ذیل میں رکھے
ہیں جو رسالت کی حیثیت لیے ہوئے نہ تھے (غالباً ان کی مراد

کھا جاتا ہے اور یہ خیال کرنے لگ جاتا ہے کہ یہ کام تو پھر کاملین کے کرنے کا ہے، عام انسان کہاں سے اتنے وصف لے کر آسکتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہر صفت کا ہر شخص میں بدرجہ کمال پایا جانا لازم نہیں ہے اور نہ یہی لازم ہے کہ کسی میں وہ پہلے ہی قدم پر پوری تربیت یافتہ شکل میں موجود ہو۔ ہمارا مقصود ان باتوں کے بیان کرنے سے صرف یہ بات ذہن نشین کرنا ہے کہ اس کام کو محض "خدمتِ قوم کا ایک کام" سمجھ کر یونہی کھڑے ہونے کے بجائے اپنے نفس کا جائزہ لے کر سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس کام کے لیے جو اوصاف مطلوب ہیں ان کا مادّہ بھی موجود ہے یا نہیں۔ بس مادّہ اگر موجود ہے تو آغازِ کار کے لیے کافی ہے۔ اس کو پرورش کرنا اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک ترقی دینا بعد کے مراحل سے تعلق رکھتا ہے جس طرح ایک ذرا سا بیج زمین میں جڑ پکڑنے کے بعد آہستہ آہستہ غذا پاکر تناور درخت بن جاتا ہے۔ لیکن بیج ہی موجود نہ ہو تو کچھ بھی نہیں بن سکتا۔ اسی طرح صفاتِ مطلوبہ کا مادّہ موجود ہو تو مناسب سعی و کوشش اور تربیت سے وہ بتدریج کمال تک پہنچ سکتا ہے۔

اصلاح و تعمیر کے لیے ایک صحیح لائحہ عمل جتنا ضروری ہے اس سے بہت زیادہ ضروری ایسے کارکنوں کا وجود ہے جو اس کام کے لیے موزوں اخلاقی اوصاف رکھتے ہوں کیونکہ آخر کار جس چیز کو معاشرے کے بگاڑ سے نبرد آزما اور تعمیرِ صالح کی آزمائشوں سے دوچار ہونا ہے وہ کسی لائحہ کی دفعات نہیں بلکہ ان لوگوں کی انفرادی و اجتماعی سیرت ہے جو میدانِ عمل میں کام کرنے کے لیے آگے بڑھیں اس لحاظ سے وہ اوصاف جو بنیادِ کار کی حیثیت سے اس کام میں حصہ لینے والے ہر فرد کے اندر موجود ہونے چاہئیں یہ ہیں (۱) دین کا صحیح فہم (۲) اس پر پختہ ایمان (۳) اس کے مطابق سیرت و کردار (۴)

(۴) اس کی اقامت کو مقصدِ زندگی بنانا۔

پھر وہ اوصاف، جو خدمت کے لیے اٹھنے والی جماعت میں پائے جانے چاہئیں، یہ ہیں :۔

(۱) باہمی محبت، حسنِ ظن، اخلاص، ہمدردی و خیر خواہی اور ایک دوسرے کے لیے ایثار۔

(۲) آپس کے مشورے سے کام کرنا اور مشاورت کے اسلامی آداب کو ملحوظ رکھنا۔

(۳) نظم وضبط، باضابطگی و باقاعدگی، تعاون اور ٹیم اسپرٹ۔

(۴) تنقید بغرضِ اصلاح جو سلیقے اور معقول طریقے سے ہو جس سے جماعت کے اندر رونما ہونے والی خامیوں کا بروقت تدارک ہو سکے، نہ کہ خرابیوں میں اُلٹا اضافہ۔

اور پھر اس کے ساتھ وہ اوصاف جو سعیٔ اصلاح کو صحیح خطوط پر چلانے اور حقیقی کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے ناگزیر ہیں، یعنی اُس اللہ کے ساتھ گہرا تعلق اور اسی کی رضا کے لیے کام کرنا۔

۲۔ آخرت کی باز پرس کو یاد رکھنا اور اجرِ آخرت کے سوا کسی دوسری چیز پر نگاہ نہ رکھنا۔

۳۔ حُسنِ اخلاق ۴۔ صبر ۵۔ حکمت۔

اب ہمیں یہ دکھانا ہے کہ وہ بڑی بڑی برائیاں کیا ہیں جن سے اس مقصدِ عظیم کے خادموں کو پاک ہونا چاہیے۔

وہ عیب جو ہر بھلائی کی جڑ کاٹ دیتا ہے

اولین اور بدترین عیب جو ہر بھلائی کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ کبر و فخر، خود پسندی اور تعلّی ہے۔ یہ ایک سراسر شیطانی جذبہ ہے جو شیطانی کاموں کے لیے موزوں ہو سکتا ہے خیر کا کوئی کام اس کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ بندوں میں بڑائی کا گھمنڈ ایک جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ جو شخص یا گروہ اس جھوٹے پندار میں مبتلا ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ہر تائید سے محروم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ کو سب سے بڑھ کر

یہی چیز اپنی مخلوق میں ناپسند ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مرض کے مریض کو کبھی راہ راست کی طرف ہدایت نہیں ملتی، وہ پے درپے جہالتوں اور حماقتوں کا ارتکاب کرتا ہے، یہاں تک آخر کار ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خلقِ خدا کے ساتھ برتاؤ میں اس سے تکبر کا جتنا جتنا اظہار ہوتا جاتا ہے اتنی ہی اس کے خلاف نفرت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مبغوضِ خلائق ہو کر وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اس کا کوئی اخلاقی اثر لوگوں میں قائم ہو سکے۔

خیر کے لیے کام کرنے والوں میں یہ بیماری کئی راہوں سے آتی ہے۔ کم ظرف لوگوں میں یہ اس راہ سے آتی ہے کہ جب ان کی دینی و اخلاقی حالت گرد و پیش کے معاشرے کی بہ نسبت کسی حد تک بہتر ہو جاتی ہے اور کچھ قابل قدر خدمات بھی وہ بجا لاتے ہیں جن کا اعتراف دوسروں کی زبانوں سے ہونے لگتا ہے، تو شیطان ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے کہ اب تم واقعی بڑی چیز ہو گئے ہو۔ اور شیطان ہی کی اکساہٹ سے وہ اپنی بڑائی اپنی زبان اور اپنے طرزِ عمل سے جتانے پر اُتر آتے ہیں۔ اس طرح وہ کام جس کا آغاز نیکی کے جذبے سے ہوا تھا رفتہ رفتہ ایک نہایت غلط راہ پر چل پڑتا ہے۔ دوسرا راستہ اس کے آنے کا یہ ہے کہ جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ ایک طرف اپنی اور دوسری طرف خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے ہیں ان کے اندر لامحالہ کچھ بھلائیاں پیدا ہوتی ہیں کسی نہ کسی حد تک وہ اپنے معاشرے کی عام حالت سے ممتاز ہوتے ہیں، کچھ نہ کچھ ان کی خدمات قابلِ قدر ثابت ہوتی ہیں اور یہ ایسے واقعی امور ہیں جو بہر حال محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ امرِ واقعی کا احساس بجائے خود فطری اور ناگزیر ہے۔ مگر نفس کی ایک ذرا سی ڈھیل اور شیطان کی ایک ذرا سی اکساہٹ اسے تکبر اور خود پسندی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر بسا اوقات ایسی صورتیں بھی پیش آتی ہیں کہ جب ان کے مخالفین ان کے کام میں اور کام سے گذر کر ان کی ذات میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو

انھیں مجبوراً اپنی مدافعت میں ایسی باتیں کہنی پڑتی ہیں جو چاہے بیانِ واقعہ ہی ہوں مگر اپنے محاسن کے اظہار سے خالی نہیں ہوتیں۔ اس چیز کو ذرا سی بے اعتدالی جائز حد سے بڑھا کر تفاخر کی حدوں میں پہنچا دیتی ہے۔

یہ ایک خطرناک چیز ہے جس سے ہر اس شخص اور جماعت کو خبردار رہنا چاہیئے جو خلوص کے ساتھ اصلاح کا مقصد لے کر اُٹھے۔ ایسے ہر شخص میں فرداً اور ایسی ہر جماعت میں مجتمعاً عبدیت کا احساس نہ صرف موجود بلکہ زندہ اور تازہ رہنا چاہیئے۔ اسے کبھی یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ کبریائی صرف خدا کی ذات کے لیے مخصوص ہے، بندے کا مقام عجز و نیاز کے سوا اور کچھ نہیں۔ کسی بندے میں اگر فی الواقع کوئی بھلائی پیدا ہو تو یہ اللہ کا فضل ہے فخر کا نہیں، شکر کا مقام ہے۔ اللہ کے حضور اور زیادہ عاجزی پیش کرنی چاہیے اور اس تھوڑی سی پونجی کو خیر کی خدمت میں لگا دینا چاہیے تاکہ اللہ اپنے مزید فضل سے نوازے اور پونجی ترقی کرے۔ بھلائی پاکر غرورِ نفس میں مبتلا ہونا تو دراصل اسے برائی سے بدل لینا ہے اور یہ ترقی کا نہیں بلکہ تنزل کا راستہ ہے۔

احساسِ بندگی کے بعد دوسری چیز جو انسان کو تکبر کے رجحانات سے بچا سکتی ہے وہ محاسبۂ نفس ہے۔ جو شخص اپنا ٹھیک حساب لگائے اور اپنی خوبیوں کو محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھے کہ وہ کن کمزوریوں اور خامیوں اور کوتاہیوں میں مبتلا ہے، وہ کبھی خود پسندی و خود پرستی کے مرض کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اپنے گناہوں اور قصوروں پر کسی کی نگاہ ہو تو استغفار سے اس کو اتنی فرصت ہی نہ ملے کہ استکبار کی ہوا اس کے سر میں سما سکے۔

اس غلط رجحان کو روکنے والی ایک اور چیز یہ ہے کہ آدمی صرف ان پستیوں ہی کی طرف نہ دیکھے جن سے وہ اپنے آپ کو بلند پاتا ہے، بلکہ دین و اخلاق کی ان بلندیوں کو بھی دیکھے جن کے مقابلہ میں ابھی وہ بہت پست ہے۔ اخلاق و روحانیت کی پستیاں بھی لامتناہی

ہیں اور بلندیاں بھی لا متناہی۔ بُرے سے بُرا آدمی بھی نیچے کی طرف دیکھے تو کسی کو اپنے سے بدتر پاکر اپنی برتری پر فخر کر سکتا ہے۔ مگر اس فخر کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی موجودہ حالت پر مطمئن ہو کر بہتر بننے کی کوشش چھوڑ دیتا ہے۔ بلکہ اس سے گزر کر نفس کی شیطنت اُسے یہ اطمینان بھی دلاتی ہے کہ کچھ اور زیادہ نیچے اتر جانے کی بھی ابھی گنجائش ہے۔ یہ نقطۂ نظر صرف وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو اپنی ترقی کے دشمن ہیں۔ ترقی کی سچی طلب رکھنے والے ہمیشہ نیچے دیکھنے کے بجائے اوپر دیکھتے ہیں۔ ہر بلندی پر پہنچ کر مزید بلندیاں ان کے سامنے آتی ہیں جنہیں دیکھ کر فخر کے بجائے اپنی پستی کا احساس ان کے دل میں خلش پیدا کرتا ہے اور یہی خلش انہیں اور زیادہ اوپر چڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔

ان سب چیزوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جماعت ہر وقت اس معاملہ میں چوکنی رہے اور اپنے دائرے میں کبر اور تعلّی اور فخر و غرور کے ہر ظہور کا نوٹس لے کر بروقت اس کا تدارک کرے۔ مگر تدارک کی یہ کوشش کبھی ایسے طریقوں سے نہ ہونی چاہئے کہ لوگوں میں بناوٹی انکسار اور نمائشی تواضع کی بیماری پیدا ہو جائے۔ کبر کی اس سے بدتر کوئی قسم نہیں ہے جس پر تصنّع کے ساتھ عجز و انکسار کا پردہ ڈالا گیا ہو۔

وہ چیز جو خلوص اور ایمان کی ضد ہے

دوسرا بڑا عیب جو خیر کی جڑوں کو کھا جانے میں کبر سے کسی طرح کم نہیں، یہ ہے کہ کوئی شخص اور گروہ بھلائی کا کام نمود و نمائش کے لیے کرے اور اس کام میں اسے خلق کی تحسین حاصل کرنے کی فکر یا اس کی پروا ہو۔ یہ چیز صرف خلوص ہی کی نہیں، حقیقت میں ایمان کی ضد بھی ہے۔ اور اسی بنا پر اسے چھپا ہوا شرک قرار دیا گیا ہے۔ خدا اور آخرت پر ایمان کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ انسان صرف خدا کی رضا کے لیے کام کرے۔ اسی سے اجر کی آس لگائے۔ اور دنیا کے بجائے آخرت کے نتائج پر نگاہ رکھے۔ لیکن ریاکار انسان خلق کی

رضا کو مقصود بنانا ہے۔ خلق ہی کے اجر کا طالب ہوتا ہے، اور دنیا ہی میں اپنا اجر نام و نمود، شہرت، ہر دل عزیزی، نفوذ و اثر اور حشمت و جاہ کی شکل میں پا لیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خلقِ خدا کو شریک یا اس کا مدِ مقابل بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آدمی خدا کے دین کی خواہ کتنی اور کیسی ہی خدمت کرے، بہرحال وہ نہ خدا کے لیے ہوگی نہ اس کے دین کی خاطر ہوگی اور نہ اس کا شمار خدا کے ہاں نیکیوں میں ہوگا۔

صرف یہی نہیں کہ یہ ناپاک جذبہ نتیجہ کے اعتبار سے عمل کو ضائع کر دیتا ہے، بلکہ درحقیقت اس کے ساتھ کوئی صحیح عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس جذبے کی فطری خاصیت یہ ہے کہ آدمی کو کام سے زیادہ کام کے اشتہار کی فکر ہوتی ہے۔ وہ اسی کو کام کو سمجھتا ہے جس کا ڈھنڈورا دنیا میں پٹے اور تحسین و آفریں کا خراج وصول کر کے لائے۔ خاموش کام جس کا خدا کے سوا کسی کو پتہ نہ ہو اس کے نزدیک کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس طرح آدمی کے عمل کا دائرہ صرف قابلِ اشتہار اعمال تک محدود ہو جاتا ہے اور اشتہار کا مقصود حاصل ہو جانے کے بعد خود ان اعمال کے ساتھ بھی اسے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ آغاز میں خواہ کتنے ہی خلوص کے ساتھ عملی زندگی کی ابتداء کی گئی ہو۔ یہ بیماری لگتے ہی خلوص اس طرح غائب ہونا شروع ہو جاتا ہے جیسے دق کی بیماری آدمی کی قوتِ حیات کو کھا جاتی ہے۔ پھر اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ منظرِ عام سے ہٹ کر بھی نیک رہے اور اپنا فرض سمجھ کر بھی کوئی فرض بجا لائے۔ وہ ہر چیز کو اس کی نمائشی قدر اور تحسینِ خلق کی قیمت کے لحاظ سے جانچتا ہے۔ ہر معاملہ میں صرف یہ دیکھتا ہے کہ دنیا کس روش کو پسند کرتی ہے اور کسی ایسے کام کا تصور کرنا بھی اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے جو دنیا میں اسے غیر مقبول بنائے خواہ ایمانداری کے ساتھ اس کے ضمیر کی آواز یہی ہو کہ وہ کرنے کا کام ہے۔

گوشوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے والوں کے لیے اس فتنے سے بچنا نسبتاً بہت

آسان ہے۔ مگر جو لوگ پبلک میں آکر اصلاح اور خدمت اور تعمیر کے کام کریں وہ ہر وقت اس خطرے میں مبتلا رہتے ہیں کہ نہ معلوم کب اس مرض کے جراثیم ان کے اندر نفوذ کر جائیں۔ انھیں بہرحال بہت سے کام وہ کرنے پڑتے ہیں جو منظر عام پر آتے ہیں، انھیں عوام الناس کو اپنا ہم نوا بنانے اور ان کے اندر اثر حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے ان کے کام کی بہت سی ضروریات اس بات پر بھی انھیں مجبور کرتی ہیں کہ اپنے کاموں کی رودادیں شائع کریں۔ ان کی کچھ نہ کچھ خدمات ایسی بھی ہوتی ہیں جو ان کی طرف خلق کا رجوع بڑھاتی اور زبانوں سے ان کے لیے تحسین کے کلمات نکلواتی ہے۔ انھیں مخالفتوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہے اور اپنی مدافعت میں با دل ناخواستہ ہی سہی انھیں مجبوراً اپنے اچھے پہلوؤں کو نمایاں کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ شہرت ہو مگر شہرت کی چاٹ نہ لگے، نمود اور نمائش ہو مگر نمود و نمائش کی خاطر کام کرنے کی بیماری نہ لگے، مقبولیت ہو مگر وہ مقصود نہ بننے پائے، تحسین خلق حاصل ہو مگر اس کے حصول کی فکر یا اس کی پروا نہ ہو۔ ریا کی پیدائش کے اسباب چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں مگر ریا سے دامن بچا رہے۔ اس کے لیے بڑی کاوش، بڑی توجہ اور بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ ایک ذرا سا تساہل بھی اس معاملے میں ریا کاری کے جراثیم کو گھس آنے کا راستہ دے سکتا ہے۔

اس سے بچنے کے لیے انفرادی کوشش بھی ہونی چاہیئے اور اجتماعی کوشش بھی انفرادی کوشش کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ ایسے نیک اعمال کا التزام کرے جو زیادہ سے زیادہ اخفا کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ اپنے نفس کا جائزہ لے کر دیکھتا رہے کہ اُسے زیادہ دلچسپی ان مخفی نیکیوں میں محسوس ہوتی ہے یا ان نیکیوں میں جو منظر عام پر آنے والی ہوں۔ اگر دوسری صورت ہو تو آدمی کو فوراً خبردار ہونا چاہیے کہ ریا اس کے اندر نفوذ کر رہا ہے

اور اللہ سے پناہ مانگتے ہوئے پوری قوتِ ارادی کے ساتھ نفس کی اس کیفیت کو بدلنے کی سعی کرنی چاہیے۔

اجتماعی کوشش کی صورت یہ ہے کہ جماعت اپنے دائرے میں ریاکارانہ رجحانات کو کبھی پنپنے نہ دے اپنے کاموں میں اعلان واظہار کو بس حقیقی ضرورت تک محدود رکھے، شوقِ نمائش کا ادنیٰ سا اثر بھی جہاں محسوس ہو اس کا فوراً سدِّ باب کرے۔ جماعتی مشوروں اور گفتگوؤں میں یہ بات کبھی اشارۃً کنایۃً بھی برداشت نہ کی جائے کہ فلاں کام اس لیے کرنا چاہیے کہ وہ مقبولیت کا ذریعہ ہے اور فلاں کام اس لیے نہ کرنا چاہیے کہ اسے لوگ پسند نہیں کرتے، جماعت کا داخلی ماحول ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ لوگوں کی تعریف اور مذمت ہر دو سے بے نیاز ہو کر کام کرنے کی ذہنیت پیدا کرے اور اس ذہنیت کی پرورش نہ کرے جو مذمت سے دل شکستہ ہو اور تعریف سے غذا پائے اس کے باوجود اگر کچھ افراد جماعت میں ایسے پائے جائیں جن میں ریا کی بو محسوس ہو تو اُن کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے ان کے علاج کی فکر کی جانی چاہیئے۔

وہ بات جو براہ راست کردار پر اثر انداز ہوتی ہے

تیسرا بنیادی عیب نیت کا کھوٹ ہے۔ جس پر کسی خیر کی عمارت قائم نہیں ہوسکتی۔ خیر کا کام صرف اس خالص نیت ہی سے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بھلائی پھیلے اور ہم اس کے لیے سعی کر کے اللہ کے ہاں سُرخ رُو ہوں۔ اس نیت کے ساتھ اپنی کوئی ذاتی یا گروہی غرض شامل نہ ہونی چاہیئے، اپنا کوئی دنیاوی مفاد پیشِ نظر نہ ہونا چاہیے حتیٰ کہ کسی تاویل کے ساتھ بھی اس مقصدِ خیر کے ساتھ اپنے لیے کسی منفعت کی طلب یا امید کی لاگ لگی نہ رہنی چاہیئے۔ ایسا ہر لوث نہ صرف یہ کہ اللہ کے ہاں آدمی کے اجر کو ضائع کر دے گا بلکہ دنیا میں بھی اس آلودگی کے لیے ہوئے کوئی صحیح کام نہ ہو سکے گا۔ نیت کی خرابی لامحالہ

کردار پر اثر انداز ہوگی۔ اور کردار کی خرابی کے ساتھ اس جدوجہد میں کامیاب ہونا ممکن نہیں ہے جس کا اصل مقصود برائی کو مٹا کر بھلائی کو قائم کرنا ہے۔

یہاں پھر وہی مشکل پیش آتی ہے جس طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ جزوی بھلائیوں کے لیے کام کرنے کی صورت میں نیت کو اس کھوٹ سے پاک رکھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔ تھوڑا سا تعلق باللہ اور جذبۂ صادق بھی اس کے لیے کافی ہو سکتا ہے مگر جن لوگوں کے پیشِ نظر یہ ہو کہ ایک پورے ملک کے نظامِ زندگی کی اصلاح کی جائے اور اسے بحیثیت مجموعی ان بنیادوں پر استوار کیا جائے جو اسلام نے ہمیں دی ہیں، وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے صرف تعمیرِ افکار، یا صرف تبلیغ و تلقین یا صرف اصلاحِ اخلاق کی کوششوں پر اکتفا نہیں کر سکتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انہیں لامحالہ ملک کے سیاسی نظام کا رُخ بھی اپنے مقصد کی طرف موڑنے کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور سیاسی نظام کی تبدیلی لازماً اس بات کو متضمن ہے کہ جو لوگ اس تبدیلی کے لیے کوشاں ہوں۔ اقتدار یا تو براہِ راست ان کے ہاتھ میں آئے یا کسی ایسے گروہ کی طرف منتقل ہو جسے ان کی تائید اور پشت پناہی حاصل ہو۔ دونوں صورتوں میں سے خواہ کوئی صورت بھی ہو، اقتدار کا تصور سیاسی نظام کی تبدیلی سے منفک نہیں ہو سکتا۔ اب یہ قعرِ دریا میں رہ کر دامن تر نہ ہونے دینے کا معاملہ ہے کہ ایک جماعت یہ کام کرے اور پھر بھی اس کے افراد کی انفرادی نیتوں اور پوری جماعت کی مجموعی نیت کو "اپنے لیے اقتدار کی طلب" کا لوث نہ لگنے پائے۔ یہ چیز بڑا مجاہدۂ نفس اور بڑا تزکیۂ قلب و روح چاہتی ہے، اس معاملہ میں صحیح نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لیے دو متماثل چیزوں کا جوہری فرق اچھی طرح ذہن نشین ہونا چاہیئے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ مجموعی نظامِ زندگی کی تبدیلی چاہنے والا دوسری تبدیلیوں کے ساتھ سیاسی نظام کی تبدیلی چاہنے سے کسی طرح

صرفِ نظر نہیں کر سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سیاسی نظام کی تبدیلی آپ سے آپ اس امر کی مقتضی ہے کہ اقتدار ان لوگوں کی طرف یا ان کی پسند کے لوگوں کی طرف منتقل ہو جو اس تبدیلی کے خواہش مند ہوں۔ مگر فرق اور بہت بڑا فرق ہے "اپنے لیے" اقتدار چاہنے اور اپنے اصول و نصب العین کے لیے اقتدار چاہنے میں۔ اصول کا اقتدار چاہے عملاً اصول کے عَلَم برداروں ہی کا اقتدار ہو، "پھر بھی" اصول کا اقتدار" چاہنا اور اس کے عَلَم برداروں کا "اپنے لیے اقتدار چاہنا" حقیقتاً دو الگ الگ چیزیں ہیں جن میں روح اور جوہر کا بہت بڑا فرق ہے۔ نیت کا کھوٹ دوسری چیز میں ہے نہ کہ پہلی چیز میں اور مجاہدۂ نفس جس چیز پر مرکوز ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ پہلی چیز کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر بھی دوسری چیز کا شائبہ تک ذہن میں نہ آنے پائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ انھوں نے مجموعی نظام زندگی کو بدل کر اسلام کے اصولوں پر قائم کرنے کی جدوجہد کی یہ چیز سیاسی غلبہ و اقتدار کی بھی متقاضی تھی۔ کیونکہ دین کو پوری طرح غالب کر دینا اس کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اور عملاً اس جدوجہد کے نتیجے میں اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا بھی۔ لیکن اس کے باوجود کوئی ایمان دار آدمی یہ شبہ تک نہیں کر سکتا کہ ان کی جدوجہد کا مقصود "اپنا" اقتدار تھا۔ دوسری طرف "اپنے" اقتدار کے طالبوں سے تاریخ بھری پڑی ہے اور تاریخ میں ان کو ڈھونڈھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ دنیا میں موجود ہیں۔ عملاً اقتدار پانے کو اگر صرف ایک واقعہ کی حیثیت سے لیا جائے تو دونوں گروہوں میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن نیت کے لحاظ سے دونوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اس فرق پر دونوں کا کردار جدوجہد کے دَور کا کردار بھی اور کامیابی کے دَور کا کردار بھی ——— ناقابلِ انکار شہادت دے رہا ہے۔

جو لوگ صدق دل سے اسلام کے مطابق نظام زندگی کا ہمہ گیر اقتدار چاہتے ہوں انھیں

فرداً فرداً بھی اس فرق کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی نیت درست رکھنی چاہیے، اور ان کی جماعت کو مجموعی طور پر بھی اس امر کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ "اپنا اقتدار چاہیے" کی نیت کسی شکل میں بھی اس کے دائرے میں جگہ نہ پا سکے۔

بظاہر ایک معصوم نوعیّت کی کمزوری

پھر ایک پورا خاندانِ عیوب اس کمزوری سے جنم لیتا ہے جس کے لیے موزوں ترین نام "مزاج کی بے اعتدالی" ہے۔ نفسانیت کے مقابلے میں یہ ایک معصوم نوعیّت کی کمزوری ہے کیونکہ اس میں کسی بدنیتی، کسی بُرے جذبے، کسی ناپاک خواہش کا دخل نہیں ہوتا لیکن خرابی پیدا کرنے کی قابلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ نفسانیت کے بعد دوسرے نمبر پر آتی ہے بلکہ بسا اوقات اس کے اثرات و نتائج اتنے ہی خراب ہوتے ہیں جتنے نفسانیت کے اثرات و نتائج۔ بے اعتدالی کا فطری نتیجہ نظر و فکر کی بے اعتدالی اور عمل و سعی کی بے اعتدالی ہے۔ اور یہ چیز زندگی کے حقائق سے براہِ راست متصادم ہوتی ہے۔ نتائج کے اعتبار سے بے اعتدالی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ وہ بالعموم ناکامی کی موجب ہوتی ہے جو اُس جماعت کے لیے بھی زہرِ ہلاہل کا حکم رکھتی ہے جو اجتماعی اصلاح و تعمیر کا کوئی پروگرام لے کر اٹھی ہو۔

مزاج کی بے اعتدالی کا اولین مظہر انسان کے ذہن کا ایک رُخا پن ہے۔ اس کیفیت میں مبتلا ہو کر آدمی بالعموم ہر چیز کا ایک رُخ دیکھتا ہے۔ دوسرا رُخ نہیں دیکھتا ہر معاملہ میں ایک پہلو کا لحاظ کرتا ہے، دوسرے کسی پہلو کا لحاظ نہیں کرتا۔ ایک سمت جس میں اس کا ذہن ایک دفعہ چل پڑتا ہے، اسی کی طرف وہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ دوسری سمتوں کی جانب توجہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس سے معاملات کو سمجھنے میں مسلسل ایک خاص طرح کے عدم توازن کا ظہور ہوتا ہے۔ رائے قائم کرنے میں بھی وہ ایک ہی طرف

جھکتا ہے جس چیز کو اہم سمجھ لیتا ہے بس اسی کو پکڑ لیتا ہے۔ دوسری ویسی ہی اہم چیزیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم چیزیں اس کے نزدیک غیر وقیع ہو جاتی ہیں۔ جس چیز کو بُرا سمجھ لیتا ہے اسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے، دوسری ویسی ہی بلکہ اس سے زیادہ بڑی برائیاں اس کے نزدیک قابلِ توجہ نہیں ہوتیں۔ اصولیت اختیار کرتا ہے تو جمود کی حد تک اصول پرستی میں شدّت دکھانے لگتا ہے، کام کے عملی تقاضوں کی کوئی پروا نہیں کرتا عملیت کی طرف جھکتا ہے تو بے اصولی کی حد تک عملی بن جاتا ہے اور کامیابی کو مقصود بنا کر اس کے لیے ہر قسم کے وسائل و ذرائع استعمال کر ڈالنا چاہتا ہے۔

یہ کیفیت اگر اس حد تک رُک جائے تو آگے بڑھ کر یہ سخت انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر آدمی اپنی رائے پر ضرورت سے زیادہ اصرار کرنے لگتا ہے اختلاف رائے میں شدّت برتنے لگتا ہے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو انصاف کے ساتھ نہ دیکھتا ہے، نہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ ہر مخالف رائے کو بد سے بدتر معنی پہنا کر ٹھکرانا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز روز بروز اسے دوسروں کے لیے اور دوسروں کو اس کے لیے ناقابل برداشت بناتی چلی جاتی ہے۔

اس مقام پر بھی بے اعتدالی رک جائے تو خیریت ہے لیکن اگر اسے خوبی سمجھ کر مزید پرورش کیا جائے تو پھر معاملہ بدمزاجی، اور چڑچڑے پن اور تیز زبانی اور دوسروں کی نیتوں پر شک اور حملوں تک پہنچ جاتا ہے جو کسی اجتماعی زندگی میں بھی نبھنے والی چیز نہیں ہے۔

ایک آدمی یہ رَوِش اختیار کرے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہوگا کہ وہ اکیلا جماعت سے کٹ جائے گا اور اس مقصد کی خدمت سے محروم رہ جائے گا جس کی خاطر وہ جماعت سے وابستہ ہوا تھا۔ اس سے کوئی اجتماعی نقصان واقع نہ ہوگا۔ مگر

جب کسی اجتماعی ہیئت میں بہت سے متوازن ذہن اور غیر معتدل مزاج جمع ہو جائیں تو پھر ایک ایک قسم کا عدمِ توازن ایک ایک ٹولی کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ ایک انتہا کے جواب میں دوسری انتہا پیدا ہوتی ہے۔ اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے جاتے ہیں، پھوٹ پڑتی ہے۔ دھڑے بندی ہوتی ہے اور اس کشمکش میں وہ خراب ہو کر رہتا ہے جسے بنانے کے لیے بڑی نیک نیتی کے ساتھ لوگ جمع ہوئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کام انفرادی کوششوں سے کرنے کے نہیں ہوتے بلکہ جن کی نوعیت ہی اجتماعی ہوتی ہے، انھیں انجام دینے کے لیے بہر حال بہت سے لوگوں سے مل کر کام کرنا ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی بات سمجھانی اور دوسروں کی باتیں سمجھنی ہوتی ہیں۔ طبیعتوں کا اختلاف، قابلیتوں کا اختلاف، ذاتی خصوصیات کا اختلاف اپنی جگہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود سب کو آپس میں موافقت کا ایک تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے جس کے بغیر کوئی تعاون ممکن نہیں ہوتا۔ اس موافقت کے لیے کسر و انکسار ناگزیر ہے۔ اور یہ کسر و انکسار صرف معتدل مزاج کے لوگوں ہی میں ہو سکتا ہے جن کے خیالات بھی متوازن ہوں اور طبیعتیں بھی متوازن۔ غیر متوازن لوگ جمع ہو بھی جائیں تو زیادہ دیر تک جمع رہ نہیں سکتے۔ ان کی جمعیت پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی، اور جن ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر ایک ایک قسم کے عدم توازن کے مریض جمع ہوں گے، ان میں پھر تفرقہ رونما ہوگا۔ یہاں تک کہ آخر کار ایک ایک امام مقتدیوں کے بغیر ہی کھڑا نظر آئے گا۔

جن لوگوں کو اسلام کے لیے کام کرنا ہو اور جنہیں جمع کرنے والی چیز اسلام کے اصول پر نظامِ زندگی کی اصلاح و تعمیر کرنے کا جذبہ و ولولہ ہو، انھیں اپنا محاسبہ کر کے اس بے اعتدالی کی ہر شکل سے خود بھی بچنا چاہیے اور ان کی جماعت کو بھی یہ فکر ہونی چاہیے کہ اس کے دائرے میں یہ مرض نشوونما نہ پائے۔ اس باب میں کتاب اللہ

اور سنت رسول اللہؐ کی وہ ہدایت ان کے پیش نظر رہنی چاہئیں جو انتہا پسندی اور شدت سے منع کرتی ہیں۔ قرآن جس چیز کو اہل کتاب کی بنیادی غلطی قرار دیتا ہے وہ غلو فی الدین ہے، (یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ) اور اس سے بچنے کی تاکید نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبعین کو ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

خبردار! انتہا پسندی میں نہ پڑنا کیونکہ تم سے پہلے لوگ دین میں انتہا پسندی اختیار کر کے ہی تباہ ہوئے ہیں۔ (مسند احمد بروایت ابن عباسؓ)

ابن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک تقریر میں تین بار فرمایا:۔

"برباد ہو گئے شدت اختیار کرنے، مبالغے اور تعمق سے کام لینے والے" (مسلم)۔

اس دعوت کے علم برداروں کو جس طریقے پر کام کرنا چاہیئے وہ اس کے داعیٔ اول نے یہ سکھایا ہے۔

"سہولت دو، تنگ نہ کرو، بشارت دو، نفرت نہ دلاؤ" (بخاری و مسلم)

"اللہ نرم خو ہے، ہر معاملہ میں نرم رویّے کو پسند کرتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

جو نرم خوئی سے محروم ہوا وہ بھلائی سے بالکل محروم ہو گیا۔ (مسلم)

ان جامع ہدایات کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ اسلامی نظام زندگی کے لیے کام کرنے والے لوگ اگر قرآن و سنت سے اپنے مطلب کی چیزیں چھانٹنے کے بجائے اپنے مزاج اور نقطۂ نظر کو اُن کے مطابق ڈھالنے کی عادت ڈالیں تو ان کے اندر آپ سے آپ وہ توازن اور توسط و اعتدال پیدا ہوتا چلا جائے گا جو دنیا کے حالات و معاملات کو قرآن و سنت کے دیئے ہوئے نقشے پر درست کرنے کے لیے درکار ہے۔

"بے اعتدالیٔ مزاج" سے ملتی جلتی ایک اور کمزوری بھی انسان میں ہوتی ہے، جسے "تنگ دلی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جسے قرآن میں "شُحِّ نفس" سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ فلاح اس شخص کے لیے ہے جو اُس سے بچ گیا اور جسے قرآن، تقویٰ

اور احسان کے برعکس ایک غلط میلان قرار دیتا ہے۔ اس مرض میں جو شخص مبتلا ہو وہ اپنی زندگی کے ماحول میں دوسروں کے لیے کم ہی گنجائش چھوڑنا چاہتا ہے۔ وہ خود جتنا بھی پھیل جائے۔ اپنی جگہ اُسے تنگ ہی نظر آتی ہے، اور دوسرے جس قدر بھی اس کے لیے سکڑ جائیں اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنے لیے وہ ہر رعایت چاہتا ہے مگر دوسروں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کر سکتا۔ اپنی خوبیاں اس کے نزدیک ایک صفت ہوتی ہیں، اور دوسروں کی خوبیاں محض ایک اتفاقی حادثہ۔ اپنے عیوب اس کی نگاہ میں قابلِ معافی ہوتے ہیں۔ مگر دوسروں کا کوئی عیب وہ معاف نہیں کر سکتا۔ اپنی تمام مشکلات کو تو وہ مشکلات سمجھتا ہے۔ مگر دوسروں کی مشکلات اس کی رائے میں محض بہانہ ہوتی ہیں۔ اپنی کمزوریوں کے لیے جو الاؤنس وہ خود چاہتا ہے، دوسروں کو وہ الاؤنس دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ دوسروں کی مجبوریوں کی پروا کیے بغیر وہ ان سے انتہائی مطالبات کرتا ہے جو خود اپنی مجبوریوں کی صورت میں وہ کبھی پورے نہ کرے۔ اپنی پسند اور اپنا ذوق وہ دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر دوسروں کی پسند اور ان کے ذوق کا لحاظ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ یہ چیز ترقی کرتی رہے تو آگے چل کر خوردہ گیری و عیب چینی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ دوسروں کی ذرا ذرا سی باتوں پر آدمی گرفت کرنے لگتا ہے، اور پھر جوابی عیب چینی پر بلبلا اٹھتا ہے۔

اسی تنگ دلی کی ایک شکل زود رنجی، تنک چڑھا پن اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنا ہے۔ جو اجتماعی زندگی میں اس شخص کے لیے بھی مصیبت ہے جو اس میں مبتلا ہو اور اُن لوگوں کے لیے بھی مصیبت جنہیں ایسے شخص سے واسطہ پڑے۔

کسی جماعت کے اندر اس بیماری کا گھس آنا حقیقت میں ایک خطرے کی علامت ہے اجتماعی جدوجہد بہرحال آپس کی الفت اور باہمی تعاون چاہتی ہے۔ جس کے بغیر چار آدمی بھی مل کر کام نہیں کر سکتے۔ مگر یہ تنگ دلی اس کے امکانات کو کم ہی نہیں، بسا اوقات ختم

کردیتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ تعلقات کی تلخی اور باہمی منافرت ہے۔ یہ دلوں کو پھاڑ دینے والی اور ساتھیوں کو آپس میں الجھا دینے والی چیز ہے۔ اس مرض میں جو لوگ مبتلا ہوں وہ عام معاشرتی زندگی کے لیے بھی ناموزوں قرار پائیں گے خصوصیت کے ساتھ یہ صفت ان صفات کے بالکل ہی برعکس ہے جو اسلامی زندگی کے قیام کی جدوجہد کے لیے مطلوب ہیں۔ وہ تنگدلی کے بجائے فراخ دلی، بخل کے بجائے فیاضی، گرفت کے بجائے عفو و درگزر اور سخت گیری کے بجائے مراعات چاہتا ہے۔ اس کے لیے حلیم اور متحمل لوگ درکار ہیں۔ اس کا بیڑا وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو بڑا ظرف رکھتے ہوں، جن کی سختی اپنے لیے اور نرمی دوسروں کے لیے ہو، جو اپنے عیوب اور دوسروں کی خوبیوں پر نگاہ رکھیں، جو تکلیف دینے کے بجائے تکلیف سہنے کے خوگر ہوں اور چلتوں کو گرانے کے بجائے گرتوں کو تھامنے کا بل بوتا رکھتے ہوں۔ جو جماعت ایسے لوگوں پر مشتمل ہوگی وہ نہ صرف خود آپس میں مضبوطی کے ساتھ جُڑی رہے گی بلکہ اپنے گردوپیش کے معاشرے میں بھی بکھرے ہوئے اجزاء کو سمیٹتی اور اپنے ساتھ جوڑتی چلی جائے گی۔ اس کے برعکس تنگ دل اور کم ظرف لوگوں کا مجمع خود بکھرے گا اور باہر بھی جس جس سے اس کا سابقہ پیش آئے گا اسے نفرت دلا کر اپنے سے دور بھگا دے گا۔